اسلامی حکومت اور مذہبی حکومت میں فرق

(از عبدالحمید صاحب بی اے)

زیردستوں پر زبردستوں کے ظلم و استبداد کی داستان اتنی ہی پرانی ہے جتنی مدنی الطبع انسان کی عمرانی زندگی کی تاریخ۔ ظلم کے یہ ہتھیار ہر زمانے کے حالات اور عوام کے میلان و اعتقاد کے مطابق بدلتے تو رہے۔ لیکن کاٹ سب کی یکساں رہی۔ مظلوم الحال انسانوں پر اگر ایک وقت میں قیصر و کسریٰ کی شکل میں ملوکیت نے ظلم ڈھائے تو دوسرے وقت میں پوپ اور پاپاؤں اور برہمنوں نے مذہبیت کی قبا سے دستِ ظلم دراز کیا۔ اسی لئے اگر شہنشاہیت کا نام لینے سے ہمارے سامنے شام و عراق کے سلاطین، مصر و روما کے بادشاہوں، اور چین و ہندوستان کے خاقان و فغفور اور راجاؤں کے جور و جفا کا تصور آتا ہے تو مذہبی حکومت یا تھیوکریسی کا نام لینے سے بھی نمائندگانِ مذہب اور ارباب کنیسہ اور برہمنوں کے لرزہ خیز مظالم کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ انسانی ذہن فوراً پلٹ کر ان بے گناہ شہداء محققین کی طرف جاتا ہے جنہوں نے انتہائی مظلومیت اور بے کسی کی حالت میں ان مذہبی دیوانوں کے ہاتھوں اذیت ناک موت پائی۔ مذہبی گروہ کے نام سے انسان کی آنکھوں کے سامنے پُرغضب چہرے، چڑھی ہوئی تیوریاں، شرر فشاں آنکھیں، تنگ سینے اور پردریلوں کے بھدے دماغ آتے ہیں۔ جنہوں نے تہذیب و شائستگی اور شرافت و متانت کی ہر متاع سے دامن چھڑا رکھا ہے۔ جنہوں نے نہایت ہی کج فہمی سے زمانہ کے رہوار کا رُخ ان منزلوں کی طرف پھیرنا چاہا جن کو یہ طے کر چکا تھا۔ اس گروہ کے پیش نظر صرف ایک کام تھا کہ لوگوں کو خدا اور آخرت کا نام لے کر ڈرائیں اور ان کے گاڑھے پسینے سے حاصل کی ہوئی کمائی کو ذاتی آرام و آسائش پر بے دریغ صرف کریں۔ تھیاکریسی کی اصطلاح سب سے پہلے قدیم یہودی مؤرخ جوزیفس نے وضع کی۔ اور اس سے مقصود وہ اندازِ حکومت تھا جو بنی اسرائیل کی ابتدائی زندگی میں مروج تھا۔ بنی اسرائیل کے ہاں خدا کے متعلق یہ عقیدہ موجود تھا کہ وہ ان پر حکومت کرتا تھا۔ شروع شروع میں اس عقیدہ سے مفہوم کچھ ہی ہو۔ لیکن رفتہ رفتہ خدا کی حکومت کچھ اور ہی صورت اختیار کر گئی۔ چنانچہ یوں کہئے کہ یہوواہ (خدا) کا مقدس ہیکل اور کتاب شریعت (جو دراصل فقہا کے فتاوے پر مشتمل تھی) خود

احبار و رہبان ـــــ ان تینوں کے مجموعہ کا نام حکومت خداوندی تھا۔ ان کے ہاں اجتہاد کا تو تصور ہی نہ تھا۔ تورات کی تختیاں ایک مقدس صندوق میں بند ایک مقدس مقام پر رکھی رہتی تھیں۔ اب خدا کی کتاب شریعت جس طرح مدون ہوتی تھی اسکی تفصیل گیٹل کے الفاظ میں دیکھئے۔ وہ اپنی کتاب (Theory of the State) میں لکھتا ہے۔

"قانون آلہی ایک سونا منڈھے ہوئے صندوق میں رکھا جاتا تھا۔ جس کی وہ کہنی حفاظت کرتے تھے۔ اور جس کی تنظیم الہام ربانی کے مرکز کی حیثیت سے کی جاتی تھی۔ تابوت خیمہ کے اندر ایک پردہ کے پیچھے قدس الاقدس میں رہتا تھا۔ اور کاہنوں کی طرف سے پورے اہتمام سے اسکی نگرانی ہوتی تھی۔ یہیں کا کاہن اعظم یہوہ کے احکام معلوم کرتا اور لوگوں کو مطلع کرتا۔ قضاۃ جو قبائل میں شریعت کی تنفیذ پر مامور تھے اور یہ کام خدا کے نام پر انجام دیتے تھے کیونکہ حکم صرف اللہ کے لئے تھا اور اگر ان کے سامنے کوئی معاملہ ایسا آجاتا جس کا فیصلہ ان کے لئے مشکل ہوتا تو اس میں ان کے لئے ضروری ہوتا کہ لاویوں کے ذریعہ سے خدا کی مرضی معلوم کریں"۔

یہ تو تھی احبار و رہبان کی حکومت۔ جب ان میں بادشاہت آگئی تو بادشاہ کے متعلق یہ عقیدہ قائم کیا گیا کہ وہ مامور من اللہ ہے۔ اور خدا کی مرضی کو پورا کرنے والا۔ چنانچہ ہیکل کی برکات بادشاہ کے شامل حال اور مقدس راہبوں کی دعائیں اسکی محافظ و نگران ہوتیں۔ اسی طرح حکومت اور برہمنیت کے امتزاج سے ایک ایسا خدائی نظام حکومت وجود میں آگیا۔ جو مقدس استبداد کا مجسمہ تھا۔ وہی نظام جو ہندوستان میں برہمن اور کھشتری راجاؤں کے تعاون سے وجود میں آیا۔ اس نظام میں راجہ کو ایشور کا اوتار قرار دیا جاتا تھا جس کی رکھشا (حفاظت) براہمنوں کی اشیرباد (دعا) کرتی تھی۔ یہی وہ روح تھی جو مسلمانوں کے دورِ حکومت میں بادشاہ کو ظلِ آلہی قرار دینے کا موجب بنی۔

دورِ جدید میں تھیاکریسی کی مثال تبت میں لاما۔ اور جاپان میں شنٹو ازم کے مطابق شاہنشاہ جاپان کی حکومت ہے۔ جنہیں زمین پر خدا سمجھا جاتا ہے۔ اور جن کے تقدس کا یہ عالم ہے کہ اگر بادشاہ سڑک پر سے گزر رہا ہو تو کھڑکیاں بند کر دی جاتی ہیں۔ کوئی مکان شہنشاہ کے مکان سے بلند تر نہیں کیا جا سکتا[لہ]۔ کسی شخص کو بھی بادشاہ پر تنقید کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ وہ جاپانیوں کا معبود ہے۔ اور ہر لحاظ سے بری عن الخطا ہے۔ پوپ کا اقتدار بھی اسی شان

لہ دیکھئے Insid Asia: By John Gunther

کی جھلک ہے۔

اسلامی حکومت کو بدقسمتی سے اسی طرح کی مذہبی حکومت سمجھ لیا گیا ہے۔ غیر تو غیر خود مسلمانوں کا ایک اچھا خاصا طبقہ اسلامی حکومت سے یہی مراد لیتا ہے اسی لئے اس کی طرف دعوت دینے والوں کی آواز وحشت و دیوانگی کی آواز اور ایک ناقابل عمل نظریئے کی آواز سمجھتا ہے۔

اس افسوسناک غلط فہمی کے اسباب وعلل کا جب ہم تجزیہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے اسلامی حکومت کی حقیقت کو سمجھنا غیر مسلموں اور خود مسلمانوں کے لئے دشوار ہو گیا ہے تو ہمیں دو بڑی اور بنیادی غلط فہمیوں کا سراغ ملتا ہے پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ اسلام کو ان معنوں میں محض ایک مذہب سمجھ لیا گیا ہے جن میں لفظ مذہب عموماً بولا جاتا ہے۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ اسلامی ریاست اور یہودی اور عیسائی ریاستوں کے مقاصد وجود کے اختلاف کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

مذہب کے معنی عام اصطلاح کے اعتبار سے بجز اس کے اور کیا ہیں کہ وہ چند عقائد اور چند عبادات اور مراسم کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے مذہب کو واقعی ایک پرائیویٹ معاملہ ہونا چاہیئے انسان اور خدا کے درمیان۔ لیکن اسلام کا معاملہ اس سے برعکس ہے۔ اس کا اپنا ایک نظریہ حیات ہے جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا پوری طرح احاطہ کیئے ہوئے ہے۔ اس لحاظ سے مسلمان مستقل اقدار کے حامل ہیں ایک متعین اسلوب حیات اور انداز زیست کے مالک ہیں۔ ان کا مسلمان ہونا اس حقیقت کا متقاضی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے کسی خانے میں بھی سوائے اسلام کے کوئی رنگ بھر نہیں سکتے۔

ان کی پوری جدوجہد کا کچھ مقصود ہی یہی ہے کہ اسلامی اقدار کی برتری اور تفوق کے لئے کوشاں رہیں۔ عیسائیت یا دوسرے مذاہب کی تعلیم صرف پوجا پاٹ تک ہی محدود ہے۔ چنانچہ ازمنہ وسطیٰ میں جب عنان حکومت عیسائی پادریوں کے ہاتھ میں آئی تو ان کے پیش نظر سوائے ظاہری رسومات کے کوئی متعین پروگرام نہیں تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب مقدس کی جگہ عیسائی راہنماؤں نے لے لی۔ اب پیروی ہدایت الٰہی کی مقصود نہیں تھی۔ بلکہ ان پادریوں کی تھی۔ چنانچہ پادریوں نے سیاسی اور معاشرتی زندگی میں جو چاہا کیا۔ مگر ان کو مقبول عام کرنے کے لئے دینی تقدس کا جامہ پہنا دیا اور اپنے افکار و اعمال کو وحی الٰہی سمجھتے رہے۔ لوگوں کی وابستگی اصل تعلیم سے ختم ہوتی چلی گئی۔ اور اس کی جگہ پادریوں

کی شخصیتوں نے ہی حق وہ ٹھہرا جو "رب" کہے اور باطل وہ قرار پایا جس کو مذہبی رہنما باطل قرار دے دے۔ قرآن حکیم نے اُن کی اس زبوں حالی کا نقشہ کس بلیغ انداز سے کھینچا ہے۔ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ والمسیح ابن مریم۔ اور پھر اس کے ساتھ ان کی اس غلط روش سے انہیں متنبہ بھی کر دیا ہے۔ وما امروا الا لیعبدوا الٰھاً واحدا لا الٰہ الا ھو سبحنہ عما یشرکون۔

اسلام نے انسانوں سے یہ حق بالکل سلب کر لیا ہے کہ وہ از خود معیار حق و باطل قائم کریں۔ یہ حق صرف خدائے واحد کو ہے۔ ہر مسلمان نہیں پر شاہد علی الناس، خدا کا نائب، اور امر بالمعروف نہی عن المنکر میں براہ راست خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس لئے ایک مخصوص مذہبی گروہ کے پیدا ہونے کا یہاں شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔ یہاں تو سارا زور اس بات کا ہے کہ کون اسلام کی تعلیمات سے قریب ترین ہے۔ اس دین حنیفی کی اساس یعنی کلمہ لا الٰہ الا اللہ تو زندہ چیلنج ہے ہر اس حکومت و طاقت کے خلاف جو ایک انسان نے دوسرے انسانوں کو غلام بنانے کے لئے قائم کر رکھی ہے۔

......یہ طاقت خواہ سلاطین و ملوک کی ہو، امراء و حکام کی ہو، خاندانوں اور نسلوں کی ہو، علماء، صوفیہ و احبار و رہبان کی ہو، خواہ جمہوریت و دھینت کی ہو، خواہ خود اپنے نفس کی کیوں نہ ہو، یہ ہر اس نظام تمدن و معاشرت اور سیاست کے خلاف بغاوت ہے جو انسانوں نے خدائی قوانین کی منظوری کے خلاف قائم کر رکھے ہیں۔ تمام اطاعتیں اور اختیارات اسی اقتدار اعلیٰ کے ماتحت ہیں۔

یہ ہے وہ بنیادی اختلاف جو اسلامی ریاست اور مذہبی ریاست میں پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دونوں کے بیچ کے اساسی تخیلات ایک دوسرے سے متغائر ہیں۔ کلیسا کے معرض وجود میں آ جانے کے بعد سیاسیات پر اس کا گہرا اثر ہوا۔ پادریوں نے دنیا کے سامنے جو سیاسی فلسفہ پیش کیا وہ یہ تھا کہ حکومت گناہ کا نتیجہ ہے۔ اور اس لئے یہ برائی ہی برائی ہے۔ خداوند تعالیٰ نے سزا کے طور پر انسانوں کو ریاست کے حوالے کر دیا ہے۔ اس لئے انسان کی اپنی مرضی کا اس میں قطعاً کوئی دخل نہیں۔ ظلم و تعدی کے بازار میں عام جین ہونے کی وجہ صرف یہی ہے کہ لوگوں کا اعمال نامہ سیاہ ہے۔ لہٰذا لوگوں کو حکومت و اقتدار کے معاملہ میں کسی طرح دخیل نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ نہایت ہی صبر و شکر سے اس استبداد کو برداشت کرتے رہنا چاہیئے تاکہ اُن کے گناہوں میں کمی واقع ہوتی رہے۔ اگر اس ڈھانچہ کو بدلا گیا تو یہ برسر اقتدار گروہ

کے خلاف بغاوت نہیں بلکہ پروردگار عالم کے خلاف بغاوت ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کی طرف پروفیسر Collins نے اپنے مشہور لیکچر بعنوان[1] Unity, Catholic and Faith کی طرف مندرجہ ذیل الفاظ میں اشارہ کیا ہے "کلیسا ایک ایسی سماج میں ہے جس کی بنیاد انسانوں نے نہیں رکھی بلکہ خداوند تعالیٰ نے خود رکھی ہے، لہٰذا جس قسم کی حکومت بھی موجود ہو عین منشا الٰہی کے مطابق ہے۔ اور اس میں رد و بدل کا خیال بھی راہ راست سے انحراف ہے"۔ اسی نظریہ کا نتیجہ پروفیسر Gilchrist کے الفاظ میں یہ نکلا کہ ہر قسم کی مطلق العنانی اور استبدادیت جائز ہو گئی[2]

ریاست کے اس نظریہ کے برعکس اسلام میں خلافت الٰہیہ کے قیام کا مقصد وحید یہی ہے کہ یہ زمین ظلم و عدوان کی بجائے عدل، فتنہ و فساد کی بجائے امن، سرکشی و خونریزی کی بجائے باہمی محبت و وفاکیشی سے معمور ہو جائے۔ اور معصیت و عصیاں کاری، افتراق و تفرقہ آرائی دنیا سے ختم ہو کر عصمت و عفت، نیکی و امن، سچائی و راست بازی کا سکہ چل جائے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں تمکن عطا کرتے ہیں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر دنیا میں نیکی کا دور دورہ نہیں تو پھر اس کے لئے جدوجہد کرنی چاہئیے۔ یہاں تو استبدادیت کے سامنے سپر ڈال لینے کے برعکس اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ظلم و عدوان مالک ارض و سموات کے منشا کے خلاف ہے۔ اس لئے اسے جلد از جلد انسان کو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی سے ختم کر دینا چاہئیے۔ اسلام تو نام ہے اس یقین انگیز، ایمان پرور، اور باطل شکن تحریک کا جس میں انسان ہر غیر الٰہی ظالمانہ نظام کو ختم کر کے ایک ایسا نظام کی بنیاد خدائی ہدایت کے مطابق رکھے۔ ایک انسان کا دوسرے انسان کی اطاعت و تعبد اختیار کرنا اسلام کے نزدیک شرف انسانیت کے خلاف ہے۔ اس لئے وہ تمام انسانوں سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ اگر تم سرفرازی چاہتے ہو تو تم ان تمام طاقتوں سے بیزاری کا اعلان کر دو۔ بلکہ ان کے

---

[2] Gilchrist

خلاف حرف آنا ہو جائے۔ جو انسان نے اپنی مرضی سے بنا ڈالی ہے۔ اور پھر خدائے واحد کی اطاعت و وفاداری کو اپنا شعار بنائے۔

مذہبی حکومت اور اسلامی حکومت کے ان بنیادی نظریوں کے اختلاف کی وجہ سے دونوں کے طریق کار میں نمایاں بعد محسوس ہونے لگتا ہے۔ غیر اسلامی مذہبی ریاست، بااقتدار لوگوں کو ایک ایسے محفوظ مقام پر لا بٹھاتی ہے جہاں تنقید کے کسی تیر کی رسائی نہ ہو۔ کیونکہ اقتدار وہ براہ راست خدا سے حاصل کرتے ہیں اور وہ اسی کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ خداوند کریم کا اُن کے ہاتھوں میں عنانِ اختیار دے دینا اُن کو ہر خطا سے پاک و منزہ کر دیتا ہے۔ آرتھر ٹیمپل لیٹیلٹن (Arthur Temple Lyttelton) نے اپنے ایک لیکچر میں یہ کہا ہے کہ یسوع مسیح کا سینٹ پیٹر کو یہ کہنا کہ تم میری بھیڑوں کے رکھوالے ہو، نہ صرف سینٹ کے مقام کو بلند و برتر کرتا ہے بلکہ اُسے ہر گناہ سے منزہ ہونے کا بھی وعدہ دیتا ہے۔ اس لئے رومن کیتھولکوں کا خیال ہے کہ کوئی نہ کوئی شخصیت دنیا میں ایسی موجود رہنی چاہئے جو ہر خطا سے پاک ہو۔ اس نظریے نے انسانوں کے ہاتھ میں لامحدود اختیارات دے دیئے۔ اور یورپ میں ظلم و عدوان کا ایک ایسا بحران اٹھا کہ سارا براعظم اس کی لپیٹ میں آگیا۔

اسلامی ریاست کی اساس یہ ہے کہ حاکمیت صرف خدا کی ہے، قانون ساز بھی وہی ہے۔ اور جو اختیارات انسانوں کو دیئے گئے ہیں وہ تفویض ہوئے ہیں مالکِ ارض و سماوات سے۔ یہ وہ مقدس امانت ہے جو اُسے سونپی گئی ہے۔ یہاں تک تو مذہبی اور اسلامی ریاست میں کوئی اختلاف نہیں۔ مگر جہاں ان کے راستے الگ ہو جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ اسلام خدا کی حاکمیت اور اس کے اقتدار اعلیٰ کے تحت مسلمانوں کو ایک عمومی حاکمیت (Limited Popular Sovereignty) عطا کرتا ہے۔ بار خلافت کی امین پوری ملت اسلامیہ ہے نہ کہ ایک فردِ واحد۔ ملت اسلامیہ ہی خلیفہ کو منتخب کر سکتی ہے۔ وہی اُسے معزول بھی کر سکتی ہے ملتِ اسلامیہ ہی مسلمانوں کی مجلس عاملہ (Executive) کو چنے گی، اور اُسے توڑ دینے کا بھی اختیار ہوگا۔ ملت کا ہر فرد نظام خلافت میں ایک مساوی رکن ہے۔ اس کا طبعی نتیجہ ہے کہ خلافت کسی ایک خاندان، نسل یا قبیلہ میں محدود نہیں ہو سکتی۔ خلیفہ عام مسلمانوں پر کوئی خاص ترجیح یا فوقیت نہیں رکھتا۔ وہ مطلق العنان آمر کی حیثیت کا مالک نہیں ہے۔ وہ تو خدا اور جمہور دونوں کے سامنے جواب دہ ہے۔ اسلام میں حکومت کوئی غیر مسئول ادارہ نہیں ہے۔ کہ بر سر اقتدار آ

طبیعت کے جوش میں آئے کرتا پھرے اور کوئی اس سے پوچھنے کی جرأت نہ کرے۔ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے کہ تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جا سکتا ہے۔ خود آپ کا عمل اس بات پر گواہ ہے۔ کہ آپ بحیثیت امیر کے جو کچھ کرتے اس کے بارے میں پہلے اصحاب سے مشورہ لیتے۔

آپ کے بعد خلافت راشدہ کے دور میں ایک معمولی سا بدو یا ایک غریب سی بڑھیا بر سر عام حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر خلیفہ سے جواب طلب کرتی ہے۔ اور ان سے پوچھتی ہے کہ اے عمرؓ تم نے یہ کیوں کیا۔ اور یہ کہ تیرا فیصلہ غلط ہے۔ اس قبیل کے واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ اور پھر ایک بدو کا سب کے سامنے خلیفہ کو یہ کہنا کہ ہم تجھے تکلے کی طرح سیدھا کر دیں گے اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسلام میں حاکم اور قوت حاکمہ لوگوں کے سامنے جواب دہ ہے۔ اور وہ مطلق العنان نہیں۔ وہ اپنے اردگرد محافظت کے ایسے حصار تعمیر نہیں کر سکتی جہاں تنقید کا کوئی تیر نہ چل سکے۔ بلکہ وہ تو ہر وقت لوگوں کی نظروں کے سامنے رہتی ہے۔ اور عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کے پبلک معاملات پر تو کیا اس کے پرائیویٹ اور نجی معاملات پر بھی اگر ضرورت ہو تو بلا دریغ حرف گیری کریں اور اگر وہ اپنی اصلاح نہیں کرتی تو اسے برطرف کر دیا جائے۔

مذہبی حکومت میں چونکہ حاکم کو ما فوق الطبعی قوتوں کا حامل سمجھ دیا جاتا ہے۔ اس لئے وہاں مشورہ کی ضرورت پیش ہی نہیں آتی۔ اسلام نے نبوت کے سلسلہ کو نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم کر کے یہ اعلان کر دیا ہے کہ خداوند تعالےٰ کی طرف سے انسانوں کے سامنے جو مکمل ترین نمونہ تا قیامت پیش کیا گیا ہے وہ صرف حضور اقدس کی ذات گرامی ہے۔ اس لئے مسلمان ہونے کی صورت میں وہ سوائے رسول خدا کے کسی کی مستقل بالذات پیشوائی و رہنمائی تسلیم نہ کریں۔ دوسرے انسانوں کی پیروی جب کبھی کی جائے تو وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے تحت ہو۔ آپ کے اس دنیا سے تشریف لیجانے کے بعد کسی کو خداوند تعالےٰ کی طرف سے براہ راست پیغام نہیں آئے گا۔ لہٰذا کوئی شخص بھی بری عن الخطا ہونے کا مدعی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کسی کو بھی تنقید سے بالاتر نہیں رکھنا چاہیے۔ کسی اور کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ جب بھی کوئی معاملہ پیش آ جائے تو اسے باہم مشورہ سے طے کیا جائے۔ نبی کریمؐ کا زندگی بھر یہ معمول رہا کہ جب کبھی کوئی اہم معاملہ درپیش آتا تو وہ اہل مدینہ کو مسجد میں جمع ہونے کا حکم صادر فرماتے۔ اور ان سے مسئلہ زیر بحث پر رائے لی جاتی اور باہم مشورے سے جو فیصلہ ہوتا کیا جاتا۔ آپ کے بعد آپ کے صحابہ کا بھی یہی عمل رہا ہے

۔اسلامی حکومت اور مذہبی حکومت کا سب سے آخری فرق دونوں کے نظام مالیات میں ہے۔ Leopold Ranke نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب The History of the Pope میں بتایا ہے کہ مذہبی ریاست کے مالیات کا بیشتر حصہ اُن عہدوں سے وصول ہوتا تھا جن کو بیچا جاتا تھا۔ پھر جو لوگ ان عہدوں کو خریدتے اُن پر فیس وغیرہ کی وصولی کی قطعاً کوئی پابندی عاید نہیں کی جاتی تھی۔ وہ جس قدر چاہتے لوگوں سے جائز و ناجائز طور پر لوٹتے۔ عوام ان ظالم ٹھیکیداروں کے رحم و کرم پر تھے۔ قرآن حکیم نے بھی اُن کی اس حالت کو بیان فرمایا ہے۔

یا یھا الذین امنوا ان کثیرا من الاحبار والرھبان لیاکلون اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل اللہ

اگر آپ اس نظام مالیات پر ایک نگاہ ڈالیں تو بادی النظر میں یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ اس نظام میں ٹیکسوں اور فیسوں کا سارا بوجھ سماج کے سب سے نچلے طبقہ پر آگرتا ہے۔ امراء و برسرِ اقتدار طبقہ اس قسم کے بوجھ سے بالکل محفوظ رہتا ہے۔ ایک طرف تو وہ ہر قسم کی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اُن کی مقناطیسی حیثیت اردگرد سے مزید دولت کھینچتی رہتی ہے۔ دوسری طرف عوام ہر لحظہ مفلوک الحال ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جب ہم اسلامی نظام مالیات پر غور کرتے ہیں تو حالات اس سے بالکل مختلف پاتے ہیں۔ زکوٰۃ جو ریاست کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے امراء سے وصول کر کے صرف غرباء کی جیبوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ اس کا مقصد ہی یہی ہے کہ سماج کے اندر دولت کی گردش عام ہو۔ اور جمع شدہ دولت مسکینوں اور غریبوں کو سہارا دینے کے لئے استعمال میں لائی جائے۔ اس نظام کا منشا ہی یہی ہے کہ سماج میں غیر فطری معاشی تفریق کو مٹا کر معاشی عدل کا دور دورہ ہو۔ اور کوئی شخص سماج میں مفلوک الحال نہ رہے۔

یہ چند بنیادی اختلافات ہیں جو ایک اسلامی ریاست اور مذہبی ریاست میں پائے جاتے ہیں ؛